ڈاکٹر افضل اقبال
ترجمہ: بشیر محمود اختر

مثنوی رومی کا پیغام

مثنوی کو رومی کی شاہکار تصنیف کی حیثیت حاصل ہے، اسے پہلے مخفی حقائق کا ایک بے مثال اظہار ہی سمجھا جاتا رہا، حتیٰ کہ ایک وقت ایسا آیا جب جامی نے اسے "قرآن در زبانِ پہلوی" قرار دیا اور شاعر کو "نیست پیغمبر ولے دارد کتاب" کہا:

(پہلی فصل) مثنوی کے پیغام کا اجمالی خاکہ

رومی نے اپنی غزلوں کے مجموعے کو دیوانِ شمس تبریز کا نام دیا اور مثنوی کو حسامی نامہ کہا۔ شمس دیوان کا ہیرو تھا، اور حسام الدین مثنوی کا محرک، اسی کی بدولت یہ مثنوی معرضِ تحریر میں آئی۔ رومی نے قریباً بارہ برس کی مدت میں ۲۵۷۰۰ اشعار حسام الدین کو املا کرائے[۱]

عہدِ حاضر کا قاری مثنوی کے ایک ملخص کا تقاضا کرتا ہے جسے وہ گھنٹے بھر میں پڑھ ڈالے لیکن مثنوی جیسے بیکراں دریا کو کسی ملخص کے کوزے میں بند کرنا ممکن ہی نہیں، مثنوی کی بہترین تلخیص بھی اس کارنامے کا حسن و کمال نہ ظاہر کر سکتی ہے، نہ برقرار رکھ سکتی ہے۔ یہاں ہم صرف ایک خاکہ پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ زیادہ تر شاعر کے اپنے ہی الفاظ استعمال کریں گے۔

رومی نے اپنے زمانے میں لکھا تھا کہ اس کے معاصر ناقدین مثنوی پر اعتراض کرتے ہیں:

کایں سخن پست ست یعنی مثنوی   قصۂ پیغمبر ست و پیروی
نیست ذکر و بحث اسرارِ بلند   کہ دوانند اولیا زاں سو سمند
از مقاماتِ تبتل تا فنا   پایہ پایہ تا ملاقاتِ خدا

---

[۱] انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا اڈیشن ۱۹۵۲ء کے مطابق مثنوی کے اشعار کی تعداد تیس ہزار اور چالیس ہزار کے درمیان ہے۔ دیکھیے جلد ۱۹، ص ۶۵۰، لیکن ۱۹۷۵ء کے اڈیشن کے مقالہ نگار نے مثنوی کے اشعار کی تعداد قریباً چھبیس ہزار بتائی ہے، ملاحظہ ہو:
The New Encyclopaedia Britannica, Macropaedia, vol. 10, p. 36.

شرح و حد ہر مقام و منزلے — کہ بہ پرہ زد بر پرِ صاحب دلے
جملہ سرتاسر فسانہ و فسوں — کودکانہ قصہ بیرون و دروں

لیکن وہ یہ کہہ کر یہ تنقید مسترد کر دیتا ہے کہ:

چوں کتاب اللہ بیامد ہم بر آں — ایں چنیں طعنہ زدند آں کافراں
کہ اساطیر ست و افسانہ نژند — نیست تحقیقے و تعمیقے بلند (دفتر سوم: ۴۲۳۳-۴۲۳۹)

رومی اپنے کارنامے کی عظمت سے آگاہ ہے۔ دفتر چہارم کے نثری دیباچے میں اس نے بلا تکلف اقرار کیا ہے کہ:

اطیب الثمار لمن اجتنیٰ و اجلّ المرادات و المنیٰ . . نُور لصاحبنا و کنز لاعقابنا

(یہ عطیات میں سب سے اعلیٰ اور انعامات میں سب سے بیش قیمت ہے ..... یہ ہمارے احباب کے لیے ایک نور ہے اور اخلاف کے لیے ایک خزانہ — دیباچہ دفتر چہارم)

ہیچ نقاشے نگارد زین نقش — بے امید نفع بہر عین نقش
ہیچ کوزہ گر کند کوزہ شتاب — بہر عین کوزہ نے از بہر آب
ہیچ کاسہ گر کند کاسہ تمام — بہر عین کاسہ نے بہر طعام
ہیچ خطاطے نویسد خط بفن — بہر عین خط نہ بہر خواندن (دفتر چہارم: ۲۸۸۰-۲۸۸۶)

آخری دفتر میں رومی اپنے معترضین کی شکایت کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ:

گرچہ ماراں زہر افشاں می کنند — زہرہ تلخاں ماں پریشاں می کنند (دفتر ششم: ۲۳)

لیکن کیا کیا جائے؟ پیغام تو بہر طور پہنچ کے رہنا ہے:

زانکہ از بانگ و علالائے سگاں — ہیچ وا گردد ز راہے کارواں (ششم: ۱۲)
گر شدے عطشان بحر معنوی — فرجۂ کن در تمام مثنوی
فرجہ کن چنداں کہ اندر ہر نفس — مثنوی را معنوی دانی و بس (ششم: ۶۷-۶۸)

مثنوی تفصیلی انداز میں ایک نغمے سے شروع ہوتی ہے جو دراصل ایک استعارہ ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ نے نیستاں سے جدا ہو کر جدائی کی شکوہ سنج ہے:

ہر کسے کو دور ماند از اصل خویش — باز جوید روزگار وصل خویش

تمام موجودات کا خالق اور خود حیات کا سرچشمہ اللہ تعالیٰ ہے اور ہم سب کو اسی کی طرف لوٹنا ہے۔ قرآنِ حکیم

کے الفاظ میں : انا للہ و انا الیہ راجعون ۔

دوسری لفظوں میں ساری ہستی روحانی بنیادوں پر قائم ہے۔ وہ مخلوق جسے انسان کہتے ہیں، خدائے تعالیٰ کی حسین ترین مخلوق ہے، اس مخلوق کو اس نے اپنی صورت میں تشکیل کیا اور اس میں اپنی روح کا ایک حصہ پھونکا۔ روح جسم سے مستور نہیں ہوتی، دونوں کا باہمی رابطہ بڑا گہرا ہوتا ہے اور آفاقی ذات میں سے ظہور پذیر ہونے والی مکمل شخصیت کو اس کی شناخت میں کوئی دقت نہیں ہوتی۔

تن ز جان و جان ز تن مستور نیست — لیک کس را دیدِ جاں دستور نیست (اول : ۸)

شعورِ روح میں منطق نہیں بلکہ عشق جان ڈالتا ہے :

آتشِ عشقست کاندر نے فتاد — جوششِ عشقست کاندر مے فتاد (اول : ۱۰)

کائنات کی تخلیق اللہ تعالیٰ کا ایک عمل ہے۔ اس نے فرمایا ہو جا اور وہ ہو گیا، کن فیکون ۔ تب سے ہم مکان اور لامکان میں معلق ہیں۔ وحدتِ مطلق نے اپنا اظہار کائناتِ مظہری کی تخلیق کی صورت میں کیا اور ہم اپنی اصل عفت اور خلقی وحدت کی بازیافت کے لیے کوشاں ہیں۔ اس عمل میں لاتعداد تضادات رونما ہوئے ہیں۔ پانی سے روغن نکال لیا گیا ہے جو اب خود مختلف وجود کی حیثیت اختیار کر گیا ہے، دونوں باہم حل نہیں ہوتے۔ گلاب نے کانٹوں میں سے سر نکالا اور دونوں ایک دوسرے سے دست و گریباں ہیں۔ کون کس کے خلاف مدد کا طالب ہے، موجود غیر موجود سے؟ نیکی اور بدی میں کیا تصادم ہے یا کیا یہ ایسی انواع ہیں جو پُر فریب اور بے بنیاد ہیں؟

ایں عجب کیں رنگ از بے رنگ خاست — رنگ بابے رنگ چوں در جنگ خاست (اول، ۲۴۷۰)

خداوند تعالیٰ نے تخلیقِ کائنات کے وقت اپنے آپ کو مکانی ابعاد میں شامل نہیں کیا :

در زمین و آسمان و عرش نیز — من نگنجم ایں یقیں داں اے عزیز

در دلِ مومن بگنجم اے عجب — گر مرا جوئی در آں دلہا طلب

گفت ادخل فی عبادی تلتقی — جنۃ من رویتی یا متقی (اوّل: ۲۶۵۴-۲۶۵۶)

انسان وہ کائناتِ اصغر ہے جس نے اپنی ترکیب میں عالمِ اکبر (کائنات) کو مسحور کیا ہے، اس کے اندر سینکڑوں ان دیکھی دنیائیں موجود ہیں :

اُمتِ وحدی یکی و صد ہزار

لیکن اس گتھی کو ناخنِ تدبیر نہیں سلجھا سکتے، البتہ اولیا جو کامل العقل ہوتے ہیں، طالب کی الجھن سلجھا کر یول

حل کردیتے ہیں جیسے پتھر کو پانی کردیا ہو۔ حضور اکرم رسول اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بارے میں بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ آپ محض ایک انسان سے زیادہ کچھ حیثیت نہیں رکھتے لیکن دراصل وہ آپ کے شرارہ درخشاں کو نہیں دیکھتے۔ ہمارا ادراکِ حقیقت اصحابِ بصیرت اور اولیا کی صحبت میں ہی فروغ حاصل کرتا ہے:

گر ترا عقلے ست جزوے در نہاں — کاملُ العقلے بجو اندر جہاں
جزو تو از کل او کلے شود — عقل کل بر نفس چوں غلے شود
پس بتاویل ایں بود کانفاسِ پاک — چوں بہارست و حیات و برگ تاک (اوّل: ۲۴۹۸ - ۲۵۰۰)

ہماری خواہشات ایمان کے ایک عمل کے آگے ماند پڑ جاتی ہیں اور روحِ انسانی پر ایک انوکھا احساس مرتب ہوتا ہے:

چشمِ احمدؐ بر ابوبکرے زدہ — او ز یک تصدیق صدیقے شدہ (اوّل: ۲۶۸۸)
من بریں در طالبِ چیزے آمدم — صدر گشتم چوں بہ دہلیز آمدم (اوّل: ۲۷۹۶)

عقل کی تنگ دامانی کو ایک نحوی اور ملاح کی حکایت میں بڑی عمدگی سے پیش کیا گیا ہے۔ نحوی دلیل و بحث سے کام لیتا ہے اور ملاح ایک سیدھا سادا انسان ہے۔ خود پرست نحوی ملاح سے سوال کرتا ہے کہ کیا تم نے کبھی نحو کا مطالعہ بھی کیا ہے؟ ملاح نفی میں جواب دیتا ہے تو مغرور نحوی اس سے کہتا ہے کہ تم نے اپنی آدھی زندگی ضائع کردی۔ اس سے بے چارہ ملاح بڑا رنجیدہ خاطر ہوتا ہے مگر خاموش رہتا ہے۔ تھوڑی دیر گزرنے پر کشتی کو طوفان آگھیرتا ہے۔ اب ملاح نحوی سے پوچھتا ہے کہ آپ کچھ تیرنا بھی جانتے ہیں؟ وہ نفی میں جواب دیتا ہے تو ملاح کہتا ہے کہ بس اب تو آپ کی ساری عمر ضائع ہوگئی۔

اس حکایت سے رومی یہ نکتہ ذہن نشین کراتا ہے کہ ایک علامہ بھی علم کے کسی ایسے شعبے میں جاہلِ مطلق ہو سکتا ہے جسے اس نے سیکھا ہی نہیں۔ عقل کے مقابلے میں عشق و روحانیت بالکل مختلف چیزیں ہیں:

گر تو علامۂ زمانے در جہاں — نک فنا نے ایں جہاں بیں ویں زماں
مرد نحوی را از آں در دوختیم — تا شما را نحو محو آموختیم
فقہِ فقہ و نحوِ نحو و صرفِ صرف — در کم آمد یابی اے یار شگرف! (اوّل: ۲۸۴۵ - ۲۸۴۷)

عقل و ادراک کی قوت جو طبعی علوم کی کنجی ہے، روحانیت کی بلند منزلوں تک رہنمائی نہیں کرسکتی:

پر کدورت شد گل آلود و گراں — زآنکہ گل خواری ترا گل شد چو ناں
ناں گلست و گوشت کمتر خور ازیں — تا نمانی ہمچو گل اندر زمیں

چوں گرسنہ می شوی سگ می شوی — تند و بدپیوند و بدرگ می شوی
چوں شدی تو سیر مردارے شوی — بے خبر بے پا چوں دیوارے شوی
پس دمے مردار و دیگر دم سگے — چوں کنی در راہ شیراں خوش تگے
آلتِ اشکار خود جز سگ مداں — کمترک انداز سگ را استخواں
زآنکہ سگ چوں سیر شد سرکش شود — کے سوئے صید و شکارِ خوش دود
آں عرب را بے نوائے می کشید — تا بدآں درگاہ و آں دولت بدید (اول: ۲۸۷۱-۲۸۸۰)

اور رومی اسی عرب یعنی پیغمبرِ اسلام حضورِ اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام سے فیضان کا آرزومند ہے، اسی لیے یہ نصیحت کرتا ہے کہ کسی پیر کی صحبت اختیار کر :

پیر را بگزیں کہ بے پیر ایں سفر — ہست بس پُر آفت و خوف و خطر (اول: ۲۹۴۳)

کسی ایسے پیر، رہنما اور رفیق کی مصاحبت ضروری ہے جو زندگی کی نازک اور پُرخطر راہوں میں رفاقت اور قیادت کا حق ادا کرسکے اور زندگی کی اصل فطرت سے آشنا کردے۔ ایسے رہنما کی جستجو کے سلسلے میں رومی تنبیہ کرتا ہے کہ :

چوں بسے ابلیس آدم روئے ہست — پس بہر دستے نشاید داد دست
حرفِ درویشاں بدزدد مردِ دوں — تا بخواند بر سلیمے زآں فسوں
کارِ مرداں روشنی و گرمیست — کارِ دوناں حیلہ و بے شرمیست (اول: ۳۱۶-۳۲۰)

جب اس قسم کا رہنما میسر آجائے تو اس کے بصیرت افروز فیصلوں کی بلاحیل و حجت تعمیل کرنی چاہیے۔ اگر وہ کشتی میں سوراخ کرتا ہے تو اپنی زبان بند رکھو، اگر وہ کسی لڑکے کو قتل کردیتا ہے تو طیش میں نہ آجاؤ، ضبط و تحمل سے کام لو اور کم ہمتی کا مظاہرہ نہ کرو۔ ایسے رہنما کا ہاتھ اللہ کا ہاتھ ہوتا ہے لیکن اس راہ میں خطرات اور خدشات بھی ہوتے ہیں۔ ایک ایسے کاتب کا واقعہ بھی بیان کیا جاتا ہے جو حضور رسول اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی وحی کتابت کیا کرتا تھا، بعد میں کاتبِ وحی نے یہ کہنا شروع کردیا کہ مجھ پر بھی وحی نازل ہوتی ہے۔ نادان دراصل اس گمان سے گمراہ ہوگیا کہ :

از برائے چارۂ ایں خوف ہا — آمد اندر ہر نمازے اہدنا
کیں نمازم را میامیز اے خدا — با نمازِ ضالین و اہلِ ریا
خاصہ اے خواجہ قیاسِ حسِ دوں — اندر آں وحی کہ ہست از فزوں

گوشِ حس تو بحرف از در خورست — داں کہ گوشِ عیب گیر تو کرست (اول: ۳۳۹۱-۳۳۹۵)

ارضی اور ملکوتی زندگی میں کوئی تضاد و تصادم نہیں ہے۔ ایک زندگی دوسری کی تکمیل کرتی ہے۔ دونوں میں سے ایک بھی قابلِ حذر نہیں یا کوئی ایک زیادہ مقدس و مطلوب نہیں۔ دونوں ایک ہی وحدت کے اجزا ہیں اور لازم و ملزوم ہیں۔ ہم اس دنیا کی زندگی سے منہ موڑ کر محض سکوت و استغراق میں رہ کر دوسری زندگی کا انتظار نہیں کر سکتے۔ زندگی سے فرار کی راہ اختیار کر کے ہم اس پر فتح نہیں پا سکتے۔ رومیؒ وقت کو سیفٌ قاطع کہتا ہے :

قال اطعمنی فانی جائعٌ — فاعجل فالوقت سیفٌ قاطعٌ

صوفی ابن الوقت باشد اے رفیق — نیست فردا گفتن از شرطِ طریق (اول : ۱۳۲-۱۳۳)

زندگی انسان کا بیش قیمت ترین تحفہ ہے۔ اسے قبول کرنے سے ہچکچانا اور اس سے وابستہ خطروں اور ذمہ داریوں سے پہلو تہی کرنا ہمیں زندگی کے بوجھ سے سبکدوش نہیں کر سکتا۔ ان سے تو اور بھی نبرد آزما ہونا ہوگا، انسان کو خون کے دریا سے گزرنا ہوگا، آلام و مصائب اور آزمائش و امتحان کا صحرا عبور کرنا ہوگا، تب کہیں خودی کے مقامِ بلند تک رسائی ممکن ہو سکتی ہے :

بہر آنست ایں ریاضت ویں جفا — تا برآرد کورہ از نقرہ جفا

بہر آنست امتحانِ نیک و بد — تا بجوشد بر سر آرد زر زبد (اول : ۲۳۲-۲۳۳)

انسان نیکی اور بدی، مصیبت اور راحت کے الفاظ استعمال کرتا ہے تو اس سلسلے میں یہ بات پیشِ نظر رہنی چاہیے کہ اس کی عقل بے حد محدود ہے اور وہ حقیقت کے محض گمان ہی پر اتراتا رہتا ہے۔ لیکن جو شخص روحانیت کی راہ پر گامزن ہوتا ہے، جلد ہی بھانپ جاتا ہے کہ اپنے محدود تجربے کے قیاسات سے زندگی کو پرکھنا خطرے سے خالی نہیں۔ ان محدودات کی شناخت کے لیے روشنی ایک شعاع کی طرح نمودار ہوتی ہے اور انھیں زائل کر دیتی ہے اس طرح خیالات کا ایک نیا سلسلہ سامنے آجاتا ہے اور اس شخص پر حقیقت افشا ہونے لگتی ہے۔ لیکن وہ اس کی شدت، گہرائی اور دلآویزی دوسروں کو نہیں بتا سکتا جو انسانی زبان، اقدار اور جذبات کی درماندگیوں کے تابع ہوتے ہیں۔ وحی کے ذریعے فیضان پانے والے لوگوں کے دلوں میں الفاظ انوکھی اہمیت اختیار کر جاتے ہیں اور اپنے بالکل اصل معانی میں نمودار ہوتے ہیں۔ حضرت موسیٰ یہ سمجھتے تھے کہ حضرت خضر حرص و ہوس میں مبتلا ہیں اور ان کے کاموں — کشتی کو چھیدنے اور لڑکے کو قتل کرنے — میں خیر کا جو پہلو پنہاں تھا اُسے نہ دیکھ سکے۔ عقلِ الٰہی سے بے شمار انسان انھیں دیوانہ معلوم ہوتا تھا، ان کے تخیل نے ان کاموں کا باطنی مفہوم اوجھل کر دیا تھا۔ عقل و منطق محدود قوتیں ہیں صرف

ن۔ الہام اور تائیدِ الٰہی انسان کے دل کو تابندگی عطا کرتے ہیں اور پھر وہ دنیا کو بالکل ہی دوسرے نقطۂ نظر سے دیکھنے لگتا ہے۔ نبی نوعِ انسان کی تاریخ میں وہ اصحابِ علم و دانش جو اپنی عقل و ذہانت کو چمکاتے رہے، سانوں کو کسی عظیم جدوجہد پر آمادہ نہ کر سکے۔ اسی طرح شاہانِ وقت اور اہلِ اقتدار بھی اس قسم کا کوئی کارنامہ بام نہ دے سکے۔ یہ صرف رسولوں اور نبیوں کا کام تھا اور ان لوگوں کا کام جنھیں باضابطہ تعلیم یا اقتدار کا دتی دعویٰ نہیں تھا کہ انھوں نے انسانوں کے دل اپنی مٹھی میں لے لیے اور انھیں جدوجہد اور کارہائے نمایاں کی رفرازیاں عطا کیں :

صد ہزاراں نیزۂ فرعون را　　درشکست از موسیٰؑ با یک عصا
صد ہزاراں طبِ جالینوس بود　　پیشِ عیسیٰؑ و دمش افسوس بود
صد ہزاراں دفترِ اشعار بود　　پیشِ حرفِ امیی اش عار بود　(اول : ۵۲۷-۵۲۹)

جو شخص الفاظ کا غلام اور اپنے حواس کا حلقہ بگوش ہوتا ہے، جلد ہی معلوم کر لیتا ہے کہ فہم و ادراک کی اور بھی اقسام و منازل ہوتی ہیں :

سیرِ بیرونیست قول و فعل ما　　سیرِ باطن ہست بالائے سما
حس خشکی دید کز خشکی بزاد　　عیسیٰؑ جاں پای بر دریا نہاد
سیرِ جسمِ خشک بر خشکی فتاد　　سیرِ جاں پا در دلِ دریا نہاد...
موجِ خاکی وہم و فہم و فکرِ ماست　　موجِ آبی محو و سکرست و فناست　(اول: ۵۷۰-۵۷۳)

عقل وہ جوہر ہے جو انسان اور حیوان میں وجہ امتیاز ہے۔ عقل و ادراک سے استفادہ ضرور کرنا چاہیے اور ان سے استفادہ ایک تکلیف دہ عمل ہے لیکن اس تکلیف سے بچنے کے لیے حیوانات کی سطح پر اتر جانا بھی کسی طرح زیبا نہیں۔ عقلِ محض تفہیمِ حقیقت کی راہ میں رہبر نہیں بن سکتی ـــ دریافت و انکشاف کے سفر پر عقل کا مفوضہ کام بدل جاتا ہے۔ ایک خاص مرحلے تک تو عقل انسان کی معلم و رہبر بن سکتی ہے لیکن اس مرحلے کے بعد وہ اس کی تابع فرمان اور آلۂ کار بن جاتی ہے :

عقل چوں جبرئیلؑ گوید احمدا　　گر یکے گامے نہم سوزد مرا
تو مرا بگذار زیں پس پیش راں　　حدِ من ایں بود اے سلطانِ جاں　(اول : ۱۰۶۶-۱۰۶۷)

ایک منزل ایسی بھی آتی ہے جب خودی کے عزم اور کائناتی خودی کے عزم کی ہم آہنگی ایسی مکمل ہو جاتی ہے کہ

جبر و اختیار کی ساری بحث ہی بے محل اور بے کار ٹھہرتی ہے۔ پھر ضابطے اور قانون میں کوئی جبر نہیں رہتا بلکہ وہ اپنی ہی دسترس میں اور اپنی رضامندی سے عائد کردہ ضابطے معلوم ہوتے ہیں۔ پھر وہ ایسی پابندیاں نہیں رہتیں جو کسی نے ہمارے وہم و گمان کی ہٹ دھرمیوں کی اصلاح کے لیے ہم پر عائد کر دی ہوں :

انبیا در کارِ دنیا جبری اند کافراں در کارِ عقبیٰ جبری اند
انبیا را کارِ عقبیٰ اختیار جاہلاں را کارِ دنیا اختیار (اول، ۶۳۷-۶۳۸)

اللہ کا بندہ اس دنیا کے احوال پر چیں بجبیں نہیں ہوتا بلکہ وہ اسے ایسے نقطۂ نظر سے دیکھنے کا اہل ہو جاتا ہے جو اس میں لاتعلقی کا احساس پیدا کر دیتا ہے۔ وہ اس دنیا میں رہتے ہوئے اس کی آلودگیوں سے پاک رہتا ہے۔ وہ بحرِ دریا میں تیرتے ہوئے بھی دامن تر نہیں ہونے دیتا۔ پھر زحمت بھی راحت بن جاتی ہے، ہر پابندی آزادی معلوم ہونے لگتی ہے اور عناصرِ اربعہ بھی اس کے تابع ہو جاتے ہیں :

چوں بخواہد عین غم شادی شود عین بندِ پائے آزادی شود
بادو خاک و آب و آتش بندہ اند با من و تو مردہ با حق زندہ اند (اول، ۸۳۷-۸۳۸)

یہ حالت کسی طور بھی ذات کو مٹا دینے کی نہیں ہوتی جیسا کہ بعض صوفیا سمجھتے ہیں۔ یہ نمو و فروغ دینے اور اپنے امکانِ اعلیٰ کی دریافت کی حالت ہے، اس میں رضا بالقضا اور خلوت گزینی فکر و سعی کا بدل نہیں بن سکتے۔ خدا پر بھروسہ تو مومن کی ایک بنیادی خصوصیت ہے لیکن وہ سعی و تحصیل کی ضرورت سے پہلو تہی نہیں کر سکتا :

گفت پیغمبر بآوازِ بلند با توکل زانوئے اشتر ببند (اول، ۹۱۳)

جب خدا لمحے بھر کے لیے بھی بے شغل و بے عمل نہیں ہوتا تو بھلا انسان کیسے ہو سکتا ہے :

کُلَّ یَوْمٍ هُوَ فِی شَأْنٍ بخواں مر ورا بے کار و بے فعلے مداں (اول، ۳۰۷)

گر توکل می کنی در کار کن کشت کن پس تکیہ بر جبار کن (اول، ۹۴۷)

. . . . کوشش بیہودہ بہ از خفتگی

اندریں رہ می تراش و می خراش تا دمِ آخر دمے فارغ مباش (اول، ۱۸۱۹-۱۸۲۲)

رومی تخلیقی ارتقا کا قائل ہے۔ وہ کسی صورت میں جسم کی قلبِ ماہیت کو نہیں مانتا۔ اس کی رائے میں ارتقا روح کی قلبِ ماہیت ہے۔ چنانچہ کہتا ہے :

اندریں امت نہ بد مسخِ بدن لیک مسخِ دل بود اے ذوالفطن

چوں دلِ بوزینہ گردد آں دلش ازدلِ بوزینہ شد خوار آں گلش (پنجم: ۲۵۹۴-۲۵۹۵)

روح اس وقت بھی موجود تھی جب نہ تو اسما تھے اور نہ وہ اشیا جن کو اسما بخشے گئے تھے۔ عشق ہی تمام آفرینش کا ارتقائی اصول ہے۔ حضرت آدم کو تمام اسما کا علم بخشا گیا تھا، پھر بھی وہ لطف و کرم کے مقامِ بلند سے نیچے جا پڑے۔ انھوں نے اپنے طور پر حکم کی توجیہ کرنا چاہی اور یوں عقل کی کم مائگی کھل گئی۔ توجیہ ذہنی گستاخی کے مترادف ہوتی ہے۔ جب حضور رسول اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا تھا کہ میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ رات بسر کرتا ہوں، وہ مجھے کھانے پینے کے لیے دیتا ہے۔ تو آپؐ دراصل استعارے میں روحانی غذا کی بات کر رہے تھے ہمیں یہ حدیث بغیر کسی کج بحثی کے تسلیم کر لینی چاہیے کیونکہ کج بحثی یا تاویل سے اصل مفہوم بدل کے رہ جاتا ہے اور اس طرح ہم گویا کرم و نوازش سے مُنہ موڑ لیتے ہیں۔ شارح اصل معنی کو ناقص اور نامکمل سمجھتا ہے اور استدلال کی مدد سے تشریح کرنے لگتا ہے۔ یہ خیال کہ اصل مفہوم ناقص ہے دراصل اس کی اپنی ناقص تفہیم سے پیدا ہوتا ہے۔ وہ اتنا سمجھنے سے قاصر رہتا ہے کہ آفاقی عقل اس کی عقل سے بلند تر ہے، اسے تو اپنی عقل کو کوسنا چاہیے نہ کہ حقیقت کو جس کا ادراک اُسے حاصل نہیں ہوسکا:

زانکہ تاویلست وادادِ عطا چونکہ بیند آں حقیقت را خطا

آں خطا دیدن زضعفِ عقلِ اوست عقلِ کل مغزست و عقلِ ما چو پوست

خویش را تاویل کن نہ اخبار را مغز را بدگوے نے گلزار را (اول: ۳۷۴۰-۳۷۴۵)

اللہ کا بندہ خوب سمجھتا ہے کہ کن کن چیزوں کو افضلیت دینا ہے۔ تضادات کا پیدا کردہ انتشار، اضداد کی پراگندگی اور متصادم وفاداریوں کے دباؤ احساس کی خوشگوار ہم آہنگی میں ڈھل جاتے ہیں۔ اس سے خودی میں ایک ایسی یک رنگی، ایک وحدت اور ایک مجموعیت پیدا ہوتی ہے جو لاتعداد ظاہری تضادات کو آنِ واحد میں ختم کر دیتی ہے :

چیست دنیا از خدا غافل بدن نے قماش و نقرہ و میزان وزن

مال را کز بہر دیں باشی حمول نعم مال "صالح" خواندش رسول

آب در کشتی ہلاکِ کشتی است آب اندر زیرِ کشتی پشتی است (اول: ۹۸۳-۹۸۵)

خداوند تعالیٰ کا ذاتی طور پر تجربہ حاصل کرنا، جو کہ ساری آفرینش خود کرتا ہے، انسان کی شخصیت کو استحکام بخشتا، اس کی تہذیب کرتا اور اس کی کایا پلٹ دیتا ہے، خداوند تعالیٰ کا نائب جو اب تک حکمرانوں سے احکام حاصل

کرتا تھا، اب دنیا پر فرماں روائی کرتا ہے، اب تک وہ ستاروں کے زیرِ اثر تھا مگر اب وہ ستاروں کا امیر کہلاتا ہے:

تاکنوں فرماں پذیرفتے ز شاہ　　بعد ازیں فرماں رساند بر سپاہ

تاکنوں اختر اثر کردے درو　　بعد ازیں باشد امیرِ اختر او　(اقبال: ۱۰۷۵-۱۰۷۶)

اس تجربے سے پہلے اس کی خواہش اس کی فکر پر حاوی تھی، اس کی ساری سوچ بچار، منطق اور دلیل بازی اس کی بے مقصد زندگی کے لیے جواز پیش کرنے پر صرف ہوتی تھی لیکن ایمان کی چمک پیدا ہوتے ہی آرام طلبی اور بے فکری کی زندگی کی تمنا ختم ہو جاتی ہے۔ اس طرح پیغامِ ربانی میں دانستہ بگاڑ کی ضرورت باقی نہیں رہتی جس میں انسان اپنی آسائش و سہولت کے لیے ایک زمانے سے رد و بدل کرتا چلا آیا ہے۔ اس پیغام کے مفہوم میں نسل در نسل تبدیلی ہوتی آئی ہے اور مقصد صرف یہ رہا ہے کہ لوگوں کے ایک خاص گروہ کے لیے جو امور تکلیف دہ تھے، ان سے چھٹکارا حاصل کیا جا سکے۔ انسان کی اپنی آسائش، طاقت اور تعیش کی خود غرضانہ خواہش نے ہمیشہ صداقت کے دروازوں کو مقفل رکھا ہے۔ اعلیٰ اور ارفع معانی کو اپنی خواہشات کے مطابق بنانے کے لیے ان کی غلط تاویلیں کر دی گئیں، خود پسندی اور اپنی خواہشوں کی پیروی ہی کو انسان ادنیٰ سے اعلیٰ درجے تک ترقی خیال کرتا ہے۔ وہ اپنی محدود عقل ہی کو حقیقت کا ثالث سمجھنے لگتا ہے لیکن جوں ہی یہ حجاب نظروں سے ہٹ جاتا ہے، اقدار کا پیمانہ بھی بدل جاتا ہے اور ہم بآسانی محسوس کرنے لگتے ہیں کہ اب تک جسے ہم ترقی کا اعلیٰ معیار سمجھ رہے تھے، فریب اور سراب کے سوا کچھ نہ تھا۔ پھر ہم پر یہ حقیقت واضح ہونے لگتی ہے کہ قارون کے خزانے بھی باقی نہ رہے، بڑی بڑی بادشاہتیں ملیامیٹ ہو گئیں کیونکہ ان کی بنیادیں محض تفاخر اور استحصال پر قائم تھیں۔ لیکن انبیا کا پیغام باقی رہا اور آج بھی حقیقت کا اعلان کر رہا ہے جسے انسان اپنی خود بینی کے سبب نظر انداز کرتا رہا ہے۔ تاہم بشریت یہی ہے، ہم جو کہ حضرت آدمؑ کی اولاد سے ہیں، اس بات پر بجا طور پر ناز کرتے ہیں کہ انھیں علم بخشا گیا تھا، انھیں علم الاسما عطا کیا گیا تھا اور ان اشیا کے نام بھی بتا دیے گئے تھے جو ابھی عالمِ وجود میں نہ آئی تھیں۔ پھر ایک ممانعت کی توجیہ کے شوق میں انھوں نے جنت سے اخراج کے نتائج بھگتے لیکن غیظ و غضب سے اس لیے محفوظ رہے کہ انھوں نے اپنی غلطی کا اعتراف کر لیا اور معافی کے خواستگار ہوئے۔ ان کی نجات غلطی کے احساس پر موقوف تھی، انسان تو خطا کا پتلا ہے لیکن جوں ہی ہمیں اپنی خطاکاری کا احساس ہونے لگتا ہے، اصلاح کا عمل بھی ساتھ ہی شروع ہو جاتا ہے:

آدمؑ از فردوس و از بالائے ہفت　　پائے ما چاں از برائے عذر رفت

گر ز پشتِ آدمے وز صلبِ او — در طلب می باش ہم در طلبِ او

ز آتش دل و آبِ دیدہ نقل ساز — بوستاں از ابر و خورشید ست باز

تو چہ دانی ذوقِ آبِ دیدگاں — عاشق نانے تو چوں نا دیدگاں

گر تو ایں انباں زناں خالی کنی — پُر ز گوہرہائے اجلالی کنی (اول: ۱۶۳۵-۱۶۴۰)

ہم حضرتِ آدم سے ہدایت کی روشنی حاصل کر سکتے ہیں یا ان کی طرح براہِ راست اصل سرچشمے سے ترسیل کے
ل سے سینکڑوں چراغ روشن ہو جاتے ہیں اور روشنی کی کیفیت میں ذرہ برابر کمی واقع نہیں ہوتی :

آدمے را اُو بخویشش اسما نمود — دیگراں را ز آدم اسما می کشود

خواہ از آدم گیر نورش خواہ ازو — خواہ از خم گیرے خواہ از کدو...

چوں چراغے نورِ شمعے را کشید — ہر کہ دید آں را یقیں آں شمع دید

ہم چنیں تا صد چراغ ار نقل شد — دیدنِ آخر لقائے اصل شد (اول: ۱۹۴۳-۱۹۴۸)

طولانی دبیل بازی اُن امور کا ادعا کرتی ہے جو اس کے حدود سے باہر ہیں، ہں کا منصب محض جزوی ہے
جب تک اُسے اپنی نارسائیوں کا احساس نہیں ہو جاتا اس کا گمراہ کرنا اغلب ہے۔ عقل گو مفید ہے مگر
ہ کے ساتھ وجدان کا اضافہ ضروری ہے :

عاشق از خود چوں غذا یابد رحیق — عقل آنجا گم بماند بے رفیق

عقلِ جزوی عشق را منکر بود — گرچہ بنماید کہ صاحب سر بود (اول: ۱۹۸۱-۱۹۸۲)

اپنی ذات کے اعلیٰ اوصاف کو بروئے کار لانے کے لیے اُن تمام قوتوں سے نبرد آزمائی ضروری ہے جو ہماری
نوونما میں رکاوٹ بنتی ہیں مثلاً لالچ، حرص، طمع اور نفرت۔ مثنوی کے دفتر اول میں رومی اور چینی نقاشوں کی
کایت میں اس نکتے کو بڑی عمدگی سے پیش کیا گیا ہے۔ چینی کہتے تھے کہ ہم بہتر مصور ہیں، رومیوں کا دعویٰ
خا کہ قوت و فضیلت تو ہمیں حاصل ہے، اس طرح چینیوں اور رومیوں کے درمیان مباحثہ شروع ہو گیا۔
بینیوں نے اپنے کمالِ فن کی نمائش کے لیے ایک کمرہ طلب کیا، چنانچہ چینی اور رومی فن کاروں کے لیے
یک بڑے کمرے میں دو دیواریں آمنے سامنے معین کر دی گئیں جن کے درمیان ایک پردہ حائل تھا۔ ایک
دیوار پر چینیوں نے اپنا کام شروع کر دیا اور دوسری دیوار پر رومیوں نے۔ چینیوں نے اپنی نقاشی کے
لیے ایک سو رنگ مانگے لیکن رومیوں نے کہا کہ ہمیں کوئی رنگ و روغن درکار نہیں، ہم تو دیوار کو صرف

صیقل کریں گے۔ چنانچہ دونوں گروہ ایک دوسرے کے کام سے بے خبر اپنے اپنے فن میں لگ گئے۔ چینیوں نے بڑی محنت سے رنگین تصویریں تیار کیں اور رومیوں نے دیوار کو خوب صیقل کر دیا۔ چینیوں نے کام ختم کر لیا تو بادشاہ ان کی فن کاری دیکھنے کے لیے کمرے میں داخل ہوا۔ ان کے فن کا حسن واقعی مسحور کن تھا۔ جب وہ رومیوں کا کام دیکھنے کے لیے دوسری دیوار کی طرف متوجہ ہوا تو درمیان کا پردہ ہٹا دیا گیا۔ چینیوں کے رنگا رنگ نقش و نگار رومیوں کی صیقل شدہ دیوار پر منعکس ہو گئے۔ یہ دیکھ کر بادشاہ متحیر رہ گیا۔ اسے چینیوں کا کام نہایت حسین و دلکش معلوم ہوا تھا لیکن رومیوں نے تو رنگ اور مُو قلم کا استعمال ہی نہیں کیا تھا۔ انھوں نے رفعِ زنگ اور صیقلی سے ہی دیوار میں حسن کا رنگ پیدا کر دیا تھا۔ اس حکایت سے جو سبق حاصل ہوتا ہے وہ یوں ذہن نشین کرایا گیا ہے:

رومیاں آں صوفیانند اے پدر!	بے ز تکرار و کتاب و بے ہنر
لیک صیقل کردہ اند آں سینہا	پاک از آز و حرص و بخل و کینہا
آں صفائے آئینہ لاشک دلست	کو نقوشِ بے عدد را قابلست...
اہلِ صیقل رستہ اند از بو و رنگ	ہر دمے بینند خوبی بے درنگ
نقش و قشرِ علم را بگزاشتند	رایتِ عین الیقین افراشتند
رفت فکر و روشنائی یافتند	نحر و بحرِ آشنائی یافتند
مرگ کیں جملہ ازو در وحشت اند	می کنند ایں قوم بروے ریش خند
کس نیابد بر دلِ ایشاں ظفر	بر صدف آید ضرر نے بر گہر (اول: ۳۴۸۳-۳۴۹۶)